ماهنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہ نامہ

مجلہ

حیات نو

بلریا گنج

جلد: ۱۴ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ اپریل ۱۹۹۶ء شمارہ: ۴

مدیر مسئول
نور محمد فلاحی

معاون مدیر
انیس احمد فلاحی

بدل اشتراک

☆ سالانہ زر تعاون	: ۵۰/- روپے	☆ طلبہ کے لیے	: ۳۰/- روپے
☆ خصوصی زر تعاون	: ۱۰۰/- روپے	☆ امدادی زر تعاون	: ۱۰۰۰/- روپے
☆ بیرون ملک سے	: ۲۵/ امریکی ڈالر	☆ قیمت فی شمارہ	: ۵/- روپے

○ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہ نامہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریا گنج
اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱ - فون نمبر ۲۵۱۱۵

کتابت:- محمد اشفاق عالم منیجر حیات نو بلریا گنج

نقوش حیات نو

		صفحہ
• اداریہ		
عیدالاضحیٰ کا پیغام		۳
• ھدایت کے چراغ		
حضرت ربیعۃ الرائےؒ	ابو جلیس ندوی	۵
• بحث ونظر		
الیکشن ۱۹۹۸... استحصال پسندوں کا طریقہ کار	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۱۵
تہذیب جدید اور مسلمان	ملک وسیم احمد فلاحی	۲۲
• مقالات		
علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے تعلیمی نظریات	سید افتخار حسین شاہ بخاری	۲۵
صاحب تدبر قرآن کی یاد میں	ڈاکٹر گل رحیم جوہر	۲۷
• مذاھب عالم		
یہودیت	انیس احمد فلاحی	۳۲
• روداد چمن		
جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب، نووار دان بساط چمن، خوشی کی بات	ادارہ	۴۴
• خطوط ومسائل	مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی	۴۷

عیدالاضحیٰ کا پیغام

عیدالاضحیٰ کا تہوار ملت حنیفی کے سب سے پہلے داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کے اس عظیم الشان کارنامہ کی یادگار ہے جو تسلیم ورضا اور بندگی وعبدیت کی تاریخ میں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتا احادیث شریفہ میں اس تہوار اور اس دن پیش کی جانے والی قربانی کی بڑی اہمیت وفضیلت بیان کی گئی ہے، ایک حدیث میں بتایا گیا ہے۔

"ما عمل آدمی من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اهراق الدم وانها لتاتی یوم القیامة بقرونها واشعارها واظلافها وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع علی الارض فطیبوا بها نفسا" (ترمذی)

بروز قربانی کسی شخص کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ بے شک ذبیحہ قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گا۔ درحقیقت قربانی کا خون بارگاہ الٰہی میں قبولیت پالیتا ہے قبل اس کے کہ وہ زمین پر بہے یا گرے۔ لہٰذا تم قربانی کرکے اپنے دل کو خوش کرو۔

قربانی کی فضیلت واہمیت کا راز اس سے حاصل ہونے والے گوناگوں فوائد ومصالح میں مضمر ہے۔ چنانچہ اس تہوار سے سنت ابراہیمی کی یاد تازہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں میں ذات باری کے لئے شکر واحسان مندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ احساس ابھرتا ہے کہ ان جانوروں کی اصل مالک ذات باری ہی ہے لہٰذا یہ جانور جن کے گوشت، دودھ، کھال، بال، خون اور ہڈی وغیرہ سے ہم بے حساب فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے نذرانے اللہ کی بارگاہ میں اس عہد کے ساتھ پیش کریں کہ اگر بندگی کا تقاضا ہوا تو ہم اللہ کی محبت پر

دوسری تمام محبتوں کو قربان کر دیں گے۔ اور اس کی محبت کے تقاضوں کی تکمیل میں جان، مال، عزت و آبرو، عزیز، اقارب، قوم، وطن، غرض ہر چیز قربان کر دیں گے۔ اسی طرح قربانی کے ذریعہ عام مسلمانوں کی روزی وغذا میں وسعت و کشادگی پیدا ہو جاتی ہے، اجتماعی کفالت، نیز ایک دوسرے کو کھلانے ہدیہ و تحفہ دینے سے دلوں کی کدورت دور ہوتی ہے اور باہمی قربت و محبت بڑھتی ہے اور رشتہ داروں، عام مسلمانوں کے درمیان تعلقات خوشگوار ہو جاتے ہیں، اور یہ بات مسلّم ہے کہ اجتماعی شیرازہ بندی کے بعد ہی فریضہ اقامت دین جیسا اہم اور مقدس فریضہ پایۂ تکمیل تک پہونچ سکتا ہے۔

قربانی کے انھیں فوائد و مصالح کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

«من وجد سعة فلم يضح فلا يقربن مصلانا» (ابن ماجہ، احمد)

جو شخص قربانی کرنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ سے دور رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو قربانی کی حقیقت کا شعور اور اس کی روح سے آگہی بخشے تاکہ وہ احکام الٰہی کی بجا آوری میں ابراہیمی اخلاص کا نمونہ پیش کریں۔

حضرت ربیعۃ الرائےؒ

ابو جلیس ندوی

ہجرت کے اکیاون سال بیت چکے ہیں۔ علم اسلام کے ولولوں سے سرشار اسلامی فوجیں تسخیر عالم کی معتبر تمنا لئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کے قدم جہاں پہنچ جاتے ہیں عقیدہ و عمل کے نور کی جوت جگا دیتے ہیں اور انسانیت کے چہرے پر تقدس کا اجالا پھیل جاتا ہے۔

انھیں لشکروں میں سے ایک لشکر سجستان کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ایک بزرگ اور باعظمت صحابی ربیع بن زیاد حارثیؓ لشکر کی قیادت کر رہے ہیں۔ انہیں کے ہمراہ ان کا ایک غلام بھی ہے جس کو فروخ کہا جاتا ہے۔

سجستان پر اسلامی فتح کا پرچم لہرانے کے بعد ماوراء النہر کے علاقوں پر ان کی نگاہ تھی۔ لیکن دریائے جیحون کی خونخوار موجیں ان کی راہ میں حائل تھیں۔ انہوں نے کمر ہمت باندھی اور از سر نو فوج ترتیب دی، پھر اللہ کا نام لے کر موجوں کے سینے کو روندتے ہوئے دریا عبور کر لیا اور دشمن کے روبرو ہو گئے۔ جب میدان کارزار گرم ہوا تو ربیع بن زیاد حارثیؓ اور ان کی جانباز فوجوں نے شجاعت اور بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ وہ تاریخ کے صفحات کی دائمی امانت بن گئے۔ ان کے غلام فروخؓ نے بھی جنگی مہارت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ سپہ سالار کی نگاہ میں ان کی عظمت دوبالا ہو گئی۔ انجام کار مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور اب دریا عبور کرنے کے بعد چین کی جانب پیش قدمی کرنے کا اسلامی فوجوں کے لئے راستہ کھل گیا۔ چنانچہ سالار نے اپنے

غلام فروخ کے بہادرانہ اقدامات دیکھے تو متاثر ہو کر انہیں آزاد کر دیا اور اپنے حصے کے تمام اموال غنیمت بطور انعام ان کو دے دیئے۔ اس کے علاوہ اپنے پاس سے بھی بہت سے عطایا کے ذریعہ ان کی تکریم کی۔

اس کے بعد ربیع بن زیاد حارثیؓ زیادہ دنوں بقید حیات نہ رہ سکے۔ صرف دو سال بعد ہی اپنے رب سے جا ملے۔ جانباز مجاہد فروخ اموال غنیمت کا ڈھیر لئے مدینہ واپس ہوئے۔ وہ جب مدینہ پہنچے تھے تو اس وقت ان کے چہرے پر جوانی کی بہاریں کھیل رہی تھیں، عمر تقریباً تیس سال رہی ہوگی، انہوں نے سوچا اب آرام اور راحت کا ایک گھر بنانا چاہئے۔ تاکہ قرار جاں کسی شریک حیات کی جلوہ گاہ بن سکے۔ چنانچہ ایک گھر خریدا اور ایک پیکر شرافت و نجابت، ایک ہوش مند اور زیرک خاتون سے شادی کر لی۔

تیس برس کار زار مجاہدانہ زندگی کے طویل اور پر مشقت مراحل کے بعد گھریلو زندگی نے لطف و لذت اور راحت و اطمینان کی نئی بہاروں سے انہیں آشنا ضرور کیا لیکن ان کے جذبہ جہاد پر غالب نہ آسکی۔ چنانچہ جب مسجد نبوی سے ایک دن اعلان جہاد ہوا تو فوراً گھر پہنچ کر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے کے لئے بیوی سے اجازت طلب کی۔ بیوی اس وقت حاملہ ہو چکی تھیں، انہوں نے کہا: جناب! آپ مجھ کو کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں، مدینہ میں آپ کا کوئی ہم قبیلہ اور ہم خاندان بھی نہیں ہے۔ آپ کی جو معصوم امانت میری کوکھ میں ہے اسے کہاں لے جاؤں گی۔ فروخ گویا ہوئے: دیکھو اللہ کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ کیا اللہ کی نصرت و حفاظت تمہارے لئے اور اس معصوم کے لئے کافی نہیں ہے۔ میں تم کو اللہ کی امان میں دیتا ہوں، اب مجھے اجازت دو۔

اور پھر وہ تیس ہزار دینار کی نقدی جو انہوں نے بڑی جانفشانی سے اپنے

اخراجات بھی پورے کرنا اور نومولود کی پرورش و پرداخت کا بھی اسی سے انتظام کرتی رہنا تاآنکہ میں جہاد سے واپس آجاؤں یا پھر اللہ میری تمنائے شہادت پوری کر دے۔ یہ کہتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رخصت ہو گئے۔

مجاہد کی روانگی کے چھ مہینے کے بعد ان کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ بچہ اتنا خوش منظر اور روشن رو تھا کہ اس کو دیکھ کر ماں شوہر کی جدائی کا سارا غم بھول گئی۔ کمسنی ہی میں نجابت و شرافت کی علامات اس میں ہویدا تھیں، اس کی حرکات و سکنات سے ہوش مندی کی کرن پھوٹتی دکھائی دیتی تھی۔ بچہ کچھ بڑا ہوا تو ماں نے اس کا نام ربیعہ رکھا اور اسے لائق معلمین کی نگہداشت میں دے دیا۔ بہت تھوڑے ہی دنوں میں بچے نے قرآن حفظ کر لیا، معتدبہ تعداد میں احادیث بھی یاد کر لیں، کلام عرب کے اکثر نمونے اس نے ازبر کر لئے اور دینی مسائل سے بھی خاطر خواہ واقفیت بہم پہنچا لی۔

ماں بچے کے معلمین کو انعام و اکرام سے نوازتی رہی اور جب بھی کبھی تربیت و لیاقت کی اس میں ترقی اور فزونی دیکھتی ان کے انعام و اکرام میں اضافہ کر دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ بچہ بڑا تعلیم یافتہ اور شائستہ ہو جائے کہ باپ آکر دیکھے تو اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، لیکن ایک مدت گزر گئی اور فروخ کی کوئی خبر اس کو نہیں ملی۔ اس نے لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی تو طرح طرح کی باتیں آئیں، کوئی کہتا کہ وہ دشمنوں کے اسیر ہو گئے، کسی نے کہا، ابھی جہاد ہی میں مصروف ہیں اور کسی نے کہا کہ ان کی آرزوئے شہادت اللہ نے پوری کر دی۔ چونکہ ان کے حالات کی کوئی خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی اس لئے انہوں نے اسی آخری خبر پر یقین کر لیا، غم کا ایک بھاری بوجھ دل پر ضرور اثر انداز ہوا، لیکن فوراً ہی اللہ سے اجر و ثواب کی طالب ہو گئیں۔

ربیعہ اب جوان ہو چکے تھے، خیر خواہوں نے ماں کو مشورہ دیا کہ بیٹے کو کوئی ہنر سکھا دیں تاکہ وہ اپنی تربیت بھی جاری رکھ سکیں اور روزی بھی اس سے کما سکیں

رہے۔ وہاں نے کہا، جس علم سے جو برتر ہو کہ وہ اس کے لئے وہی مقدر کرے جو اس کی دنیا اور آخرت دونوں کے لئے مفید ہو۔ بالآخر ربیعہ نے علم کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی متعین کر لیا۔

ربیعہ نے اپنے لئے جو منصوبہ بنایا اس منصوبے کے مطابق وہ مسجد نبوی کی علمی مجالس میں شریک ہونے لگے اور جو صحابہ موجود تھے ان کی کفش برداری کو اپنا وظیفہ حیات بنا لیا۔ صحابہؓ میں اس وقت سب سے معزز و معظم شخصیت انس بن مالکؓ کی تھی جو رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ صحابہؓ کے بعد تابعین کرام سے مستفیض ہوئے۔ طبقہ اولیٰ کے تابعین میں سعید بن مسیبؒ، مکحول شامی، سلمہ ابن دینار کے حلقہ درس سے بطور خاص منسلک ہوئے۔ تعلیم میں بے انتہا محنت اور کوشش کرتے۔ کوئی ترس کھا کر ان سے کہتا کہ اپنے اوپر کچھ رحم کرو، اتنی زیادہ محنت مت کرو تو وہ جواب دیتے کہ ہم نے بزرگوں کو کہتے سنا ہے کہ:

"علم اپنا کچھ حصہ اسی شرط پر تمہیں دے گا کہ تم اپنی پوری زندگی اس کے حوالے کر دو۔"

تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت عام ہو گئی۔ اب تلامذہ کی ایک بھیڑ ان کی گرویدہ و شیدا تھی اور عوامی مقبولیت نے ان کے سر پر بھی سیادت و قیادت کا تاج رکھ دیا۔

عالم مدینہ کی زندگی علم و دانش کی فضا میں خوش باش طریقے سے گزرتی رہی۔ دن کا ایک حصہ گھر کے لوگوں میں گزرتا اور دوسرا حصہ مسجد نبوی کے حلقات درس میں کہ اس دوران وہ واقعہ پیش آیا جس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

گرمی کا موسم تھا، چاندنی رات تھی۔ رات کا کچھ وقت گزر جانے کے بعد ایک ادھیڑ عمر شہسوار مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ وہ مدینہ کی گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا، کیونکہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ اب بھی اس کا گھر پہلی

ساحت میں موجود ہے یا نہیں۔

کیونکہ وہ تیس برس کے بعد یہاں واپس آیا تھا۔ اپنے تصورات میں محو ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کبھی نوجوان بیوی کا دلربا تصور اس کے دل کو گدگداتا، کبھی خریدے ہوئے گھر کا نقشہ ذہن میں گھوم جاتا اور کبھی اس بچے کی یاد نگاہوں میں چمک اٹھتی جسے رحم مادر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی، پھر وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور وہ تیس ہزار دینار اب بھی اس کی بیوی کے پاس موجود ہیں یا خرچ ہو گئے۔

مدینہ کی گلیوں میں اب بھی آمد و رفت جاری تھی، لیکن کوئی اسے پہچان نہ سکا۔ اپنے وطن کے لوگوں میں یہ اجنبیت دیکھی تو وہ شہسوار دل گرفتہ ہو گیا۔ اسے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے اور اب اس کے قدم بھی بوجھل ہونے لگے۔ وہ یوں اس کے پاؤں کو باندھنے لگی، گھوڑے سے اتر کر وہ پیادہ چلنے لگا۔ یکایک اس کی یادداشت جاگی اور وہ ایک گھر کے سامنے ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے ذہن پر مزید زور دیا۔ پھر اس کے دل کی شادمانی بول اٹھی کہ یہی میرا گھر ہے۔ دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔ وفور شوق میں بلا اجازت اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے مالک نے آہٹ سنی تو بالاخانے کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہاں اجنبی نیزہ و تلوار حمائل کیے کھڑا تھا۔ اس کی بیوی تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ غضب ناک ہو کر نیچے اترا اور اس کا گریبان پکڑ کر چیخا: "اللہ کے دشمن! رات کے اندھیرے میں تو گھر کے اندر کیوں آیا؟ یقیناً تیری نیت بری ہے۔" پھر دونوں باہم الجھ گئے۔ ان کا شور زیادہ بلند ہوا تو پڑوسی بھی آ گئے۔ گھر کا مالک شہسوار کا گریبان پکڑے چیخ رہا تھا کہ "میں تجھے چھوڑ نہیں سکتا۔"

اجنبی شہسوار سراسیمہ تھا، وہ صرف یہی کہہ پا رہا تھا کہ میں گنہگار نہیں ہوں، میں اسے اپنا گھر سمجھ کر اندر آیا اور یہ سچ ہے کہ یہ میرا ہی ہے۔ کیا میری

بیوی فوت ہو گئی ہے؟ اور یہ میرا گھر کسی دوسرے کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ اے لوگو! خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ، کیا تم میں سے کوئی مجھ کو نہیں پہچانتا؟ کیا تم بھول گئے کہ میں فروخ ہوں، کیا پڑوسیوں میں کوئی فروخ کو پہچاننے والا اب نہیں رہا جو اٹھائیس سال سے آرزوئے شہادت سے میدان جہاد میں خاک و خون کے دریا عبور کرتا اور فتح و ظفر کے نعرے بلند کرتا رہا۔

گھر کے مالک کی ماں سوئی ہوئی تھی۔ شور و غوغا کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بالاخانے کی کھڑکی سے نیچے دیکھا تو دہشت زدہ ہو کر رہ گئی۔ اسے یارائے سخن نہ رہا۔ صرف اسکے منہ سے یہ چیخ نکلی کہ انہیں چھوڑ دو، انہیں چھوڑ دو۔ ماں کی چیخ سن کر بیٹے نے اجنبی کا گریبان چھوڑ دیا۔ اتنے میں اس کی ماں نیچے اتر آئی اور کہا کہ بیٹے یہ تمہارے والد محترم ہیں اور اے ابو عبدالرحمٰن یہ تمہارے فرزند دلبند ربیعہ ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں آبدیدہ ہو کر باہم گلے مل گئے۔ ربیعہ نے باپ کے ہاتھ اور پیشانی چومی اور باپ کی محبت بیٹے پر نچھاور ہونے لگی۔

ربیعہ کی ماں ادب سے سلام کر کے انکو اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں فروخ اپنی سرگذشت سنانے لگے۔ وہ تیس سال کے بعد آج اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس تھے۔ وہ اپنی روداد سناتے جاتے اور بیوی کے حالات بھی پوچھتے جاتے، لیکن بیوی کسی دوسری ہی فکر میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ فکر اسکی اس خوشی کو بھی دھوپ دکھا رہی تھی جو شوہر کی ملاقات سے اسکو حاصل ہوئی تھی۔ اسے اندر سے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ شوہر نے تیس ہزار دینار اسکے پاس چھوڑے تھے۔ وہ سب بچے کی تعلیم و تربیت کی نذر ہو گئے۔ خدانخواستہ اس کے بارے میں پوچھ بیٹھے تو کیا جواب دوں گی؟ کیا کسی بچے کی تعلیم و تربیت پر اتنا خرچ آسکتا ہے؟ کیا وہ یہ بات مانیں گے کہ ان کا بیٹا بہت زیادہ کشادہ دست و فیاض ہے۔ وہ ایک درہم بھی بچا کے نہیں رکھتا۔ مدینہ کے لوگ جانتے ہیں کہ

وہ اپنے احباب پر کتنا زیادہ خرچ کرتا ہے۔ ربیعہ کی ماں ان ہی خیالات میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں کہ ان کے شوہر نے کہا، ربیعہ کی ماں! دیکھو میرے پاس اس وقت چار ہزار دینار ہیں۔ جو تیس ہزار دینار تم کو دے کے گیا تھا تو بھی اسی میں شامل کر دو۔ اس سے ہم ایک باغ اور کچھ قابل کاشت زمین خریدیں گے تاکہ گزر بسر کا سہارا اور ذریعہ ہو جائے۔

بیوی نے اس بات کو ٹال دیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

شوہر نے دوبارہ کہا جو دینار بچے ہوئے ہیں ان کو لاؤ۔ پھر دیکھا جائے کہ کل ملا کر کتنا ہو جاتا ہے۔ بیوی نے کہا آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں نے وہ تمام دینار وہیں رکھے ہیں جہاں رکھنا چاہیے۔ کچھ دنوں کے بعد انشاءاللہ وہ آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اتنے میں اذان کی آواز آئی اور بات ختم ہو گئی۔

فروخ نے لوٹا لیا، وضو کیا اور دروازے سے نکلتے ہوئے پوچھا کہ ربیعہ کہاں ہے؟ وہ پہلی اذان سن کر ہی مسجد پہنچ جاتا ہے۔ ماں نے کہا آپ کو کچھ دیر ہو گئی۔ اب شاید ہی جماعت مل سکے۔ فروخ مسجد پہنچے تو امام نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ انہوں نے تنہا نماز ادا کی۔ نماز کے بعد قبر شریف کا مواجہہ کر کے صلوۃ و سلام پڑھی پھر جس جگہ کو اللہ کے رسول ﷺ نے جنت کی ایک کیاری کہا تھا، وہاں دوگانہ نفل ادا کی۔ کچھ دیر دعا و مناجات میں مصروف رہے۔ فارغ ہو کر جب مسجد سے لوٹنے لگے تو دیکھا کہ پوری مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ طالبان علوم کا ایسا پُر وقار اجتماع ان کی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک شیخ کے گرد لوگ حلقہ بنا کر باادب بیٹھے ہوئے تھے۔ مجمع اتنا تھا کہ مسجد میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ فروخ نے مجمع پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ حلقۂ درس میں عمر دراز، عمامہ پوش علما بھی شامل ہیں اور بڑے بڑے باعظمت اہل علم بھی زانوئے تلمذ تہہ کئے ہوئے ہیں۔ سب کی نگاہیں شیخ کی جنبش لب کی منتظر ہیں، جو لفظ بھی ان کی زبان سے

طلباء موتی کی طرح ان کو چن لیتے ہیں اور تحقیق زدہ ہی کی طرح سے اپنی بیاض میں لکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ پوری مجلس پر ادب و وقار کا سکوت طاری ہے۔ شیخ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں مجمع میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے ہوئے کچھ لوگ ان کی بات کے لفظ لفظ کو بلند آواز سے دہراتے ہیں تاکہ ہر شخص ان کی بات کو پورے طور پر صحیح صحیح لکھ سکے۔

فروخ مجمع کے کنارے تھے۔ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر شیخ کو دیکھ کر پہچاننا چاہا لیکن فاصلہ کی وجہ سے نہ پہچان سکے۔ لیکن ان کی لیاقت و قابلیت، علمی شان و مرتبہ اور انکی یادداشت و حقیقت بیانی سے حد درجہ مرعوب و متاثر ہوئے .... انہوں نے دیکھا کہ شیخ کی علمی سطوت کے آگے تمام لوگ ہی خمیدہ سر ہیں...... تھوڑی ہی دیر بعد حلقہ درس ختم ہو گیا۔ شیخ کھڑے ہوئے تو سارے لوگ ان کے پیچھے پیچھے مسجد کے دروازے تک آئے۔ شیخ کا اتنا ادب و احترام دیکھا تو فروخ سے نہ رہا گیا۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ بتایئے یہ شیخ کون ہیں؟

اس آدمی نے فروخ کو تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا، "آپ ان کو نہیں جانتے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا آپ مدینہ کے باشندہ نہیں ہیں؟"

فروخ نے کہا "بھائی میں مدینہ کا ہی باشندہ ہوں"۔

اس آدمی نے کہا "بھلا مدینہ میں کوئی ایسا آدمی بھی ہو سکتا ہے جو شیخ کو نہ جانتا ہو"۔

فروخ نے کہا۔ "آپ مجھے معاف کریں، میں واقعی نہیں جانتا۔ اس لئے ان کے بارے میں بتا دیجئے"۔

اس آدمی نے کہا "آپ بیٹھئے، بتاتا ہوں۔ دیکھئے یہ شیخ بہت بڑی مرتبہ والے ہیں، امت مسلمہ کی علمی شان و شوکت کے امین، فقہاء مدینہ کی آبرو، مدینہ

الرسول کے محدث و امام ہیں، گو عمر میں ابھی نوجوان ہیں"۔

فروخ نے کہا "ماشاءاللہ لا قوۃ الا باللہ"

اس آدمی نے مزید کہا "دیکھئے انکی مجلس میں، مالک بن انس، ابو حنیفہ النعمان، یحییٰ بن سعید انصاری، سفیان ثوری، عبد الرحمٰن بن عمرو اوزاعی، لیث بن سعد جیسے علماء اور فقہاء بھی شامل درس ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہ بہت خوش اخلاق، سخی اور نیک طبیعت ہیں۔ اہل مدینہ میں ان سے فیاض کوئی نہیں اور ان سے بڑا زاہد و عابد بھی کوئی نہیں"۔

فروخ نے کہا "لیکن آپ نے ان کا نام نہیں بتایا"۔

اس آدمی نے کہا "ان کا نام ربیعۃ الرائے ہے"۔

فروخ نے تعجب سے کہا "ربیعۃ الرائے"۔

اس آدمی نے کہا "ہاں ربیعہ ہی ان کا نام ہے۔ لیکن شیوخ مدینہ اور علماء انکو ربیعۃ الرائے ہی کہتے ہیں کیونکہ علماء کسی معاملہ کے شرعی حکم میں حیران ہوتے ہیں تو ان ہی کے پاس جاتے ہیں۔ وہ اجتہاد و قیاس کے ذریعہ اس کا حکم ایسا صحیح بتا دیتے ہیں کہ سوال کرنے والا مطمئن ہو جاتا ہے"۔

فروخ نے کہا "آپ نے ان کا نسب نہیں بتایا"۔

اس آدمی نے کہا "ربیعہ بن فروخ۔ وہ جب پیدا ہوئے تو ان کے والد موجود نہیں تھے، جہاد میں گئے ہوئے تھے۔ ان کی ماں نے ان کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیا۔ میں نے نماز سے کچھ پہلے سنا ہے کہ ان کے والد فروخ تیس سال کے بعد کل شب میں گھر واپس آگئے ہیں"۔

فروخ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ مزید کچھ پوچھے بغیر گھر چلے گئے۔

بیوی نے ڈبڈبائی آنکھ دیکھا تو پوچھا "کیا ہوا آپ کو، خیریت تو ہے؟"

فروغ نے کہا "میں نے بیٹے کا جو مرتبہ و مقام دیکھا وہ آج تک
کسی کا نہیں دیکھا"۔

بیوی نے موقع غنیمت سمجھ کر فوراً کہا، "آپ بتایئے دونوں میں آپ کو کون زیادہ عزیز ہے۔ بیٹے کا یہ مرتبہ و مقام یا تیس ہزار دینار"۔

فروغ نے کہا "بخدا اس فضل و کمال اور جود و شرف کے آگے تو ساری دنیا ہیچ ہے"۔

اب بیوی نے کہا "وہ تیس ہزار دینار میں نے اسی فضل و کمال کی بلندی تک بیٹے کو پہنچانے کے لئے خرچ کر دئے۔ بتایئے آپ خوش ہیں یا نہیں؟"

فروغ کا جواب تھا "اللہ تمہیں جزائے خیر سے نوازے کہ تم نے مجھے وہ خوشی دی جس پر ہر خوشی قربان"۔

بقیہ:- تہذیب جدید اور مسلمان

ایمان فروز داستان کے لئے بدصورت، غیر روادار، اور پر تشدد مذہبی جنون کا مفہوم بھی جوڑ دیا ہے۔ اب اس کا استعمال بطور ایک کوڈ کے ہونے لگا ہے جس سے مراد اسلام ہوتا ہے۔ آجکا مسلمان صدیوں کے انسانوں کے آئینے میں جب اپنی تصویر دیکھتا ہے تو اسے اپنے چہرے پر بدعملی اور کج فکری کے اتنے بڑے بڑے داغ نظر آتے ہیں کہ وہ شرما جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر اسی تصویر کے ساتھ وہ اس دور میں ہوتا تو اسکی جگہ منافقوں کے ساتھ یا شاید اور نیچے ہوتی۔ مگر اس کے باوجود بھی اس کو بنیاد پرست کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اگر قرن اول کے لوگ اس دور میں ہوتے تو انکے لئے کونسی اصطلاح وضع کی جاتی۔

الیکشن ۱۹۹۸ء... استحصال پسندوں کا طریقہ کار

ڈاکٹر اجمل فاروقی

(دہرادون)

۹۸ء میں لوک سبھا کے لئے ماہ فروری، مارچ میں ہوئے انتخابات کے دوران سماج اور حکومت کے مختلف طبقوں اور اداروں کی طرف سے جس طرح استحصال پسند ہندؤں کی نمائندہ پارٹی، بی جے پی اور اس کے حلیفوں کی مدد کی گئی وہ خاص چونکانے والی بھی ہے اور سبق آموز بھی ہے۔

انتخابات دراصل ملک کے شہریوں کی رائے جاننے کا طریقہ ہوتے ہیں، مگر یہ رائے کیسے بنتی یا بنائی جاتی ہے ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ رائے بنانے کے عمل میں ذرائع نشر و اشاعت اخبارات و رسائل و ریڈیو، ٹی وی کا اہم رول ہوتا ہے۔ ان انتخابات کے کے دوران نام نہاد سرکاری میڈیا اور نام نہاد غیر جانبدار پریس نے جس طرح ان استحصال پسند طاقتوں کی مدد کی ہے۔ وہ ہم سب نے دیکھی اور سنی ہے۔ اس کو ایک بار سلسلہ وار دہرالیں تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

الیکشن سے پہلے ہی OPINION POLL اور EXIT POLL شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں مخصوص پارٹی کو سب سے بڑی پارٹی کے طور پر بلکہ اکثریت حاصل کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا۔

کیبل آپریٹرس کا بائیکاٹ:- بمبئی کے کیبل آپریٹرس نے ۹۸ء میں غیر بی جے پی لیڈران کے الیکشنی بیانات کا بائیکاٹ کیا بمشکل تمام پرسار بھارتی والے انہیں ان پروگراموں کو دکھانے پر راضی کر سکے۔ مگر تب تک ان کا کام ہو چکا تھا۔

میڈیا کے ضابطہ اخلاق کا حال:- جب OPINION POLL پر پابندی کا وقت

آیا تو اگلے دن بڑے اخباروں نے ایک بڑے نجومی کے حوالہ سے خبر شائع کی کہ ستاروں کی چال کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بی جے پی حکومت بنائے گی۔ اگلے دن اخباروں نے سرخیاں لگائیں کہ سٹہ بازار میں بی جے پی پر بازیاں بڑھ گئی ہیں وغیرہ تاکہ ووٹروں کی بڑی تعداد ہوا دیکھ کر جیت سکنے والے کو ووٹ دے۔

نتائج سے پہلے کے مباحثے:- DD اور DD II کے علاوہ STAR اور ZTV وغیرہ نے نام نہاد ماہرین کے ذریعہ جس طرح شروع میں بی جے پی کے جھنڈے گاڑنے کے رجحان پر خوشی ظاہر کی وہ قارئین شاید بھولے نہ ہوں۔ مزیدار بات یہ ہے کہ ان پروگراموں میں مذاکرہ یا بحث کی نظامت کرنے والے عموماً بحث کو نتائج کو، اس طرح پیش کرتے رہے کہ بی جے پی کے لئے اگلا مرحلہ آسان ہوتا ہے اور اس کے مخالفین کی بات سامنے نہ آئے۔ اور اکثریت نہ ملنے پر بھی اسی کو بلایا جائے۔ ایسے ایسے قانون دانوں کی رائے بیان کرائی گئیں کہ سب سے بڑی پارٹی کو ہی بلایا جانا چاہیے سابق صدر وینکٹ رمن کا رویہ خاص طور سے قابل غور ہے ہر مرحلہ سے پہلے مرحلہ میں ہی رائے عامہ بنا دی جاتی تھی۔

سمندر پار دوستان بی جے پی:- OVERSEAS FRIENDS OF BJP نے بھی بہت منظم انداز میں اپنی پارٹی کی مدد کی۔ اس کے لئے مالی امداد تکنیکی امداد اور اہم بات یہ کہ اپنے ہر چاہنے والے کو ذاتی خطوط امریکہ اور برطانیہ وغیرہ سے لکھا کہ بی جے پی کی مدد کریں۔ لارڈ سوراج پال نے، برطانیہ نے ہندوجا بھائی نے اور جی کے لون نے کہا کہ بی جے پی کو حکومت کے لئے بلایا جانا ہندوستان کے لئے ضروری ہے۔

تشویشناک پہلو:- ملک کے بعض حصوں خصوصاً راجستھان میں عام غریب اور کمزور مسلمانوں میں بی جے پی کسی حد تک یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئی کہ مسجد کو کب تک روتے رہیں گے ہمارے لئے اصل مسئلہ روٹی، روزی اور تحفظ کا ہے

اس رجحان کے تدارک کی ضرورت ہے اور اس پر تمام دینی حمیت رکھنے والے مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ ایمان کی قیمت پر روٹی روزی کو ترجیح دی جائے۔

مسلمانوں میں امت واحدہ کے طور پر فیصلہ لینے کے بجائے ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش ہر پارٹی نے کی شیعہ سنی منافرت لکھنؤ اور رام پور میں بی جے پی نے پھیلائی یہاں تک کہ کچھ شیعہ حضرات دکھا کر کمل پر مہر لگا رہے تھے۔ وہیں کانگریس اور ایس پی نے میرٹھ میں انصاری اور قریشی کا مسئلہ کھڑا کیا، بہار میں اگلے اور پچھڑے کی بحث پر ایک تحقیقاتی کتابچہ شائع کرایا گیا کہ ہمیشہ سے ہر پارٹی نے نام نہاد اعلیٰ ذات مسلمان کو ہی زیادہ عہدہ دیئے وغیرہ وغیرہ

عدلیہ کا رول:- خاص طور سے جس طرح یوپی وزارت کی برطرفی میں برق رفتاری سے سنوائی کی گئی اور فیصلے دیئے گئے لکھنؤ سے دہلی تک وہ بہت سے سوال چھوڑ گئے ہیں۔ خاص طور سے یہ سوال کہ بی ایس پی کے (۱۲) باغی ممبران اسمبلی کے فیصلہ میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ اس پر سپریم کورٹ نے بھی کوئی حکم نہیں دیا؟

ووٹ بینک کا فریب:- اعداد و شمار کے مطابق ۵۰ فیصد اعلیٰ ذات ہندو نے ایک ووٹ بینک کی طرح بی جے پی کو ووٹ دیئے۔ جب کہ ۶.۰ [illegible] کو مسلمانوں کے صرف ۵۱ فیصد ووٹ ملے۔ مگر ووٹ بینک بننے کا الزام مسلمانوں کے اوپر لگایا جا رہا ہے اور اس پر بحث نہیں ہونے دی کہ اعلیٰ ذات ہندو کدھر ہیں اور کیوں؟

کوئمبٹور دھماکہ:- سے پہلے ۲۹ نومبر کو پولیس اور ہندو منانی اور HMK کے ذریعہ ۲۰ مسلمانوں کے قتل، زندہ جلانے اور تقریباً ۵۰۰ کروڑ کے مالی نقصان کو میڈیا اور حکومت دبا گئی اور ایسا شاید دنیا میں کم ہوا ہو کہ فساد ہوتے ہی پولیس نے ہڑتال کر دی اور دنگائیوں کی مدد کی اور انتہا یہ کہ [illegible] کو بھی گمراہ کر کے بیوقوف بنایا۔ مگر کوئی نہیں بولا کہ اس میں کس کا ہاتھ ہے۔ جنوب میں الامہ وغیرہ کا وجود ۹۰

کی دہائی کی بات ہے جب کہ RSS نے وہاں ۱۹۸۰ء سے ہی ہندو منافی اور بعد میں HMK کے ذریعہ نفرت کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ جس کے لئے مہاراشٹر کے طرز پر دنا یک چترتھی کا جلوس ایجاد کیا گیا۔ پھر پولنگ سے عین پہلے دھماکہ کرا کر ووٹ فرقہ وارانہ حاصل کیا گیا۔ اس پر غور کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۸۰ء سے کم از کم ۱۲ سال ہندو نفرت پسندوں کو کھلی چھوٹ ملی رہی، مسلمانوں کے خلاف شرارت انگیز اور نفرت سے بھر پور مہم چلائی گئی۔ تب کسی نے کبھی نہیں بولا۔ مگر جب ہر طرف کی بے حسی سے مجبور ہو کر ایک گروہ نے عزیمت کی راہ اختیار کی تو وہ ہی ملک دشمن قرار دیئے گئے۔ الیکشن میں ووٹ حاصل کرنے کا BJP کے لئے سب سے موثر ہتھیار نفرت رہا ہے۔ بنگال میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کے خلاف، آسام میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کے خلاف، بمبئی میں یوپیا کے مسلمانوں کے خلاف، کیرالہ میں عرب کی دولت کے خلاف آندھرا میں خلیجی خوشحالی کے خلاف اور یہ کام پورا پریوار کرتا ہے۔ (یعنی RSS اور اس کے ۴۲ سے زیادہ ادارے)۔

سیکولر نیتاؤں کا پاکھنڈ:- کل ڈالے گئے ووٹ کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر بی جے پی کا فیصد بہت زیادہ تھا جسے صرف کانگریس اکیلے ہی ۲۵ فیصد سے کچھ زیادہ ووٹ لے کر اس استحصال پسند پارٹی سے آگے ہے۔ مگر ان غیر بی جے پی نیتاؤں نے صرف اور صرف ذاتی انا کی تسکین کے لئے کسی بھی مفاہمت کو نہیں ہونے دیا۔ نتیجہ عوام بھی تقسیم ہو گئے۔ یوپی اس کی سب سے بہترین مثال ہے۔ SP اور BSP کے نیتا نہیں ملے۔ جنتا دل اور کانگریس بھی نہیں ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گڑھوال سے لے کر دہلی تک اور سارے مغربی یوپی میں ایک بھی سیٹ غیر بھاجپا پارٹی کو نہیں ملی اور الزام مسلمان عوام کے سر منڈھا جا رہا ہے جب کہ مہاراشٹر میں کانگریس، BSP اور SP نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

یوپی کانگریس کی اعلیٰ ذات قیادت کا عیارانہ طرز عمل:- ۱۷ مارچ کے

پائنیر میں خبر ہے کہ یوپی کانگریس کے برہمن پرمود تیواری انا رائن دت تیواری اور جتیندر پرساد نے کسی بھی قیمت پر ملائم سنگھ یادو سے مفاہمت نہیں ہونے دی۔ اور وہ دل تھام کر وجہ جان لیجئے "ہم چاہتے ہیں کہ اس بار ملائم سنگھ بھی ہمارے ساتھ شکست کھا جائیں اور پھر ان کے اصل ووٹ بینک یعنی مسلمان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ سوائے اس کے کہ وہ مجبور ہو کر کانگریس کو اگلے الیکشن میں ووٹ دیں۔

بی جے پی کی دباؤ کی سیاست:- معاملہ الیکشن کے پروگرام کا ہو، گورنر جنڈاری کے طرز عمل کا ہو، ہماچل کے گورنر کے طرز عمل کا ہو یا ۲ پر زیادہ وقت ٹھہرنے کا یا صدر جمہوریہ سے سرکار بنانے کا بلاوا حاصل کرنے کا یہ پارٹی بیک وقت پریس میں ہنگامہ مچا کر، عدلیہ میں اپنے ہمنواؤں سے فریاد کرا کر، استحصال پسندوں کے حامی دانشوروں، قانون دانوں اور عوامی ہنگامہ آرائی اور غنڈہ گردی کے ذریعہ اپنی ناجائز مانگ کو بھی منوا لیتی ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین نمونہ کو منصوبہ بم دھماکہ ہے۔ جس میں ۲۹ نومبر کو ہوئے مسلم "مخالف پولیس فرقہ پرست مظالم کو دبا کر اس کے رد عمل اور مایوسی سے پیدا دھماکوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ جب کہ ابھی تک دھماکہ کے پیچھے اصل طاقت کو پہچانا بھی نہیں گیا ہے۔ اس بات کی پوری امید ہے کہ ان کے پس پشت خود RSS کے حامی ہو سکتے ہیں۔ یہ دباؤ کنندہ گروہی نظام سیاست ہمارے لئے ایک نقطہ غور و فکر ہے۔

نتائج:- ۱۔ ہندوستان میں عملاً RSS ذہنیت سماج اور حکومت کے موثر اداروں پر حاوی ہے۔ عدلیہ، میڈیا، قانون داں، صنعت کار، تجارتی تنظیمیں، اخبارات، دانشور، پولیس، فوج کے رجحانات موجودہ الیکشن میں کھل کر سامنے آئے۔

۲۔ کوئی بھی پارٹی مسلمانوں کی واحد آواز نہیں بننے دینا چاہتی یہ بات جتنی گراں ہے اتنی عیاں بھی ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ ہمارے پیچھے چلو۔ اپنی جنگ خود مت لڑو۔

۳۔ ہندوستان کے اعلیٰ ذات ہندو استحصال پسند جو تمام سیاسی پارٹیوں پر حاوی ہیں وہ دو پارٹی نظام کی طرف منظم سازش کر رہے ہیں تاکہ دلتوں اور مسلمانوں کی کوئی الگ

آواز اپنی آواز نہ ہو اور وہ مجبور ہو کر ہمارا ساتھ دیں۔ ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی جائے جس میں تیسری طاقت THIRD FORCE نہ رہ جائے اور ملک کی اکثریت کے لئے "کوئی متبادل نہیں" یعنی ANNA کی ذہنیت میں مبتلا ہو کر ایک فٹ بال بن جائے جو اعلیٰ ذات کے دو داؤں کی ٹھوکروں کے درمیان گردش کرتا رہے۔ اس چال کو تیسری طاقت کے نیتا سمجھتے ہیں مگر "اکیلا بے تاج بادشاہ اور مسیحا بننے کی ذہنیت" سے چھٹکارا حاصل نہ کر پانے سے آپس میں لڑ کر یوپی، بہار، مدھیہ پردیش جہاں ہندوستان کی اصل سیاسی طاقت رہتی ہے بے وزن اور ختم کر دیئے گئے۔ اوپر کے یوپی کانگریس کے اعلیٰ ذات لیڈر شپ کا بیان اگر اڈوانی کے اس بیان سے ملا کر دیکھیں تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم کانگریس کو ختم نہیں کرنا چاہتے کانگریس بطور اپوزیشن ہمارے لئے ضروری ہے۔

۴۔ یہ بات صاف ہے کہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ذات ہندو استحصال پسندوں کی اصل طاقت ہیں۔

۵۔ امریکہ اور مغرب کی مدد بھی اسی طاقت کے ساتھ ہے جیسا کہ ان طاقتوں کے اعلیٰ طاقتی وفود کی بار بار کی ملاقاتوں سے ظاہر ہے۔ پس پردہ کیا ہوا وہ بھی کچھ دنوں میں ظاہر ہو جائے گا۔

۶۔ بی جے پی کا ماہر برائے دفاع ہندوستانی فضائیہ کا سابق ایر وائس مارشل ایک ہندوستانی یہودی ہے۔

۷۔ BJP نے اپنی اقتدار کی جنگ میں تمام اصول پسندی اور نظریات کو طاق پر رکھ دیا۔ غنڈوں، بدمعاشوں، سکھ رام، جیسے ملتا سب سے مدد لی۔ مگر ہندوستان کے پڑھے لکھے ہندوؤں کو کوئی اعتراض نہیں ہے جو کہ بظاہر کرپشن اور نااہلی سے بہت دکھی ہیں۔ اور اگلے الیکشن کے لئے ابھی سے ہوا بنائی جا رہی ہے کہ ہمیں تو اس لئے اصولوں پر سمجھوتہ کرنا پڑا کیونکہ آپ نے ہمیں اکثریت نہیں دی آپ ہمیں اکثریت دیں ہم اپنے ایجنڈہ و پرانے اصولوں پر حکومت کریں گے۔

۸۔ جمہوریت کے ڈھکوسلا اور اکثریت کے جبر ہونے کا کھلا معاملہ سامنے ہے۔

ملک کی ۲۰ کروڑ آبادی کے محض ۲۷ ممبر اور وہ بھی ۵۴۳ میں سے ہیں۔

۹۔ ووٹر مجبور ہے۔ ووٹر کسی پارٹی یا فرد کو ووٹ دیتا ہے اس کی پالیسی اور پروگرام یا کم از کم رجحان کو دیکھتا ہے۔ آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی مسلمانوں کی مدد سے ان کی حمایتی بن کر BJP کی مخالفت کر کے الیکشن جیتی اور الیکشن جیتتے ہی BJP کو بالواسطہ فیصلہ کن مدد کر رہا ہے۔ اور لکشمی پاروتی جس نے BJP سے مل کر الیکشن لڑا وہ الیکشن کے بعد BJP مخالف ہو گئی تو اب یہ عوام کی نمائندگی کہاں رہی یہ تو ارکان کی سوداگری اور عوام کی مجبوری ہے اور یہ وہ طرز حکومت ہے جس پر اکیسویں صدی کو ناز ہے۔ مسلمان مجبور ہے وہ TDP سے اپنی ناراضگی کیسے ظاہر کرے اگلے الیکشن کا انتظار کرے کہ تب تک ایمان دشمن، استحصال پسند اپنی جڑیں خوب مضبوط کریں۔

۱۱۔ آر ایس ایس نے اپنی بنیادی بات حکمراں طبقہ چاہے وہ کوئی بھی ہو کے دماغ میں بٹھا دی ہے کہ ہندو مذہب نہیں سنسکرتی ہے اس لئے سنسکرتی کی بنیاد پر ہی حکومت ہی ہندوستان کی ترقی کی ضامن ہے۔ اسی لئے ہندوستان کی عدالت عظمیٰ بھی ہندوتوا کو جائز ٹھہراتی ہے۔ آر ایس ایس کی ۷۰ سالہ محنت تو گر جھوٹ، تکرار جھوٹ، نفرت اور خیالی مسلم خطرہ کے ساتھ تعلیمی نظام کے ذریعہ نوجوان نسل کو سمجھایا جا چکا ہے۔ اس وقت اسی طبقہ کی حکومت ہے۔ آئندہ انتخابات میں دہلی حکومت پر سائن بورڈ لگنے کی دیر ہے ورنہ اندر مال سب وہی ہے جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ اب آئندہ اگر تیسری طاقت یا کانگریس حکومت میں آتی ہے بھی تو یہ حکومتی اور وہ انہیں ان کے ایجنڈہ کے مطابق حکومت نہیں کرنے دیں گے۔

یہ تمام تجزیہ صرف صورت حال کی وضاحت کیلئے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حالات میں حوصلہ افزا چیزیں نہیں ہیں مگر وہ تجزیہ کا موضوع نہیں ہیں۔ اللہ اگر بصیرت دے تو دشمن سے بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ڈرنے یا خوف کھانے کے بجائے خیر امت کو اپنا منصب سمجھ کر اللہ کے آگے جواب دہی کے ساتھ اٹھنا ہوگا۔ دعوت و اصلاح، خدمت و جہاد ہمارا راستہ ہوگا۔ ان کی چالیں تو ایسی ہیں کہ پہاڑ ٹل جائیں مگر اللہ نے رسول سے کیے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا اور اللہ قدرت والا اور انتقام لینے والا ہے اور شر بھی نہیں چاہتا کہ ملک زمین پر فساد پھیلے۔

تہذیب جدید اور مسلمان

ملک رحیم احمد

حالات ہر آن متغیر ہیں۔ کسی شے کو اپنی جگہ قرار نہیں۔ زمان و مکاں کی وسعتیں اور پہنائیاں سمٹ گئی ہیں۔ ساری دنیا جام جمشید کی طرح ایک کوزے میں آ گئی ہے۔ انقلاب اب ٹیلیفیکس، ای میل، انٹرنیٹ پر سفر کرنے لگا ہے۔ انہی میں سے ایک چیز جو سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہ جدید تہذیب ہے جس کا غلغلہ ہر آن بلند ہو رہا ہے اور جس کی تان اپنے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو کا رنگ جدا جدا ہے۔

اس کا سب سے نمایاں پہلو برق رفتار ذرائع رسل و رسائل اور ابلاغ عامہ کی صورت میں ہر کہیں موجود ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نعمت بے بہا ہے۔ حالات حاضرہ، متنوع خیالات و نظریات اور معلومات عامہ کا حصول اسی کی وجہ سے ممکن ہے۔ اپنی رائے بنانے میں اور مختلف نظریات میں سے بہتر کا انتخاب کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ لیکن خیالات، رسوم اور تجربوں کی یہ یلغار ذہن اور ضرورت سے بھی زیادہ ہو رہی ہے جس سے بدہضمی کی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھنے سننے اور پڑھنے کو اتنا کچھ موجود ہے کہ سامع اور قاری حیران و پریشان ہے۔

ثقافتی دیواروں کا منہدم ہو جانا اس کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ اس اعتبار سے تو بہتر تھا کہ لوگوں کو دوسرے کلچر سمجھنے میں آسانی ہوئی مگر اب یہ صورت آئی کہ ایک مخصوص کلچر ہی بالکل زور سے اس طرح چھا رہا ہے کہ وہ سب پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ دیگر ثقافتوں کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ یہ لڑائی سرحدوں پر نہیں بلکہ ذرائع

روم میں جاری ہے۔ اس کا رخ داخل سے خارج کی طرف ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان صرف جسم ہی نہیں روح بھی ہے اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ روح ہی اصل ہے۔ جسم اس کا لباس ہے جو ایک مخصوص ماحول میں رہنے کے لئے اسے ملا ہوا ہے۔ اسی لئے انسان جتنا مرئی ہے اتنا ہی غیر مرئی بھی بلکہ شاید اس سے کچھ زیادہ۔ اعلیٰ اخلاق، کردار، اعلیٰ ظرفی، وسعت پیشانی اور محبت و رحم کے جذبات اسی روح کا پرتو ہیں۔ تہذیب جدید نے غلطی سے انسان کو بدن ہی بدن سمجھ لیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کے حواس کی حد و انتہا بھی ہے اور ان کا استعمال ذمہ داری اور اسی لئے جائز حدود تک ہی کیا جانا چاہئے۔ انسان کے اس غیر مرئی وجود کا ادراک کھو دیا تو ساری توجہ اس گوشت پوست پر مرتکز ہو گئی جس سے بظاہر وہ مرکب ہے۔ چنانچہ اسی کو سجانے سنوارنے پر محنت صرف ہونے لگی۔ بدن کو بیدار کرنے اور اس کی خواہشات کی تکمیل کا سامان کیا جانے لگا۔ نتیجہ لذتیت اور تفریح طبع مقصد زندگی بن گئے۔ جسم ہی جسم کا یہ تصور روح اور بدن کے درمیان ایک معرکہ کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جو دنیا وجود میں آ رہی ہے وہ قلبیت، لادینیت، مادیت اور بے جڑ و بے عنوان ٹوٹی پھوٹی ہوئی دنیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال کافی ہے۔ فی زمانہ جنسی تعلیم کا آوازہ بلند ہو رہا ہے کئی گوشوں سے اس کی حمایت کی جا رہی ہے۔ اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر بچپن میں ہی یہ تعلیم دے دی گئی تو جوان ہو کر وہ ایک بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ اس استدلال میں جو بات نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہے وہ یہ کہ ان بچوں کو ایک اچھا بچپن بھی تو ملنا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا بچپن بہت جلد ختم ہو جاتا ہے عجب نہیں کہ مستقبل قریب میں انہیں بچے کہنا ہی غلط ہو جائے۔ جنسی تعلیم کے حق میں دو اور دلیلیں دی جاتی ہیں۔ ایک چونکہ وہ ہر طور ایسا کر رہے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ انہیں محفوظ تر طریقہ بتایا

جائے۔ دوسرے جب وہ بڑے ہوں تو ایسا نہ ہو کہ عدم واقفیت یا غیر ضروری شرم و حیا کی وجہ سے انکی ازدواجی زندگی تباہ ہو جائے۔ اس دوسری دلیل کی حقیقت یہ ہے کہ جب سے اس تعلیم کا چلن ہوا ہے اور مختلف تدابیر کا تعارف ہوا ہے شادی کا مقدس ادارہ ہی زوال پذیر ہو گیا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت اب غیر مطمئن جوڑے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ طلاق کی شرح بڑھ گئی ہے چنانچہ جنسی تعلیم کا یہ دوسرا مقصد فوت ہو چکا ہے اور اب مغرب میں خاندانی نظام کی اس شکست و ریخت کے خلاف تحریک چل پڑی ہے۔ **Back to basics** کا نعرہ بلند ہو رہا ہے۔ پہلی دلیل کی حقیقت یہ ہے کہ جنسی تعلیم کے ذریعہ بچوں کے علم میں تو اضافہ نہیں ہوا ہے البتہ اس سے ان کو اس بات کا موقع ضرور مل گیا ہے کہ جو وہ سنتے اور دیکھتے ہیں اس پر عمل کر کے دیکھیں۔ حیرت ہے کہ چرندوں پرندوں اور دیگر جانوروں کو کتابوں، ویڈیو کیسٹ اور جنسی تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی مگر اعلیٰ تر انسانی دماغ کہتا ہے کہ اسے اسکی ضرورت ہے۔ شاید ثقافت اب دم توڑ رہی ہے اور مستقبل اب چرندوں پرندوں کے ہاتھ ہے۔

اس ایک مثال سے جس ماحول کی عکاسی ہوتی ہے اس میں اگر سب سے زیادہ وقت اور اذیت اگر کسی کے لئے ہے تو وہ مسلمان کے لئے ہے۔ مغربی دنیا اس سے متحارب نظر آتی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ جنگ الفاظ کی [illegible] اور اصطلاحوں کی [illegible] ہے۔ طرح طرح کی پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ شبیہ بگاڑنے کیلئے بہت ساری اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ جیسے **fanatic** (جنونی) **obscuranlist** ([illegible]) **orthodox** ([illegible]) اور **fundamentalist** (بنیاد پرست)۔

آخر الذکر کثیر الاستعمال اصطلاح ہے اس لئے دیکھنا ہے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ فنڈامنٹلزم کا مطلب ہے تنگ نظری کی دنیا اور بدلتے ہوئے حالات میں مذہبی بنیادوں پر برقرار رہنے کی کوشش یہ اس کا سادہ سا مفہوم ہے جس میں مغربی ذرائع

بقیہ صفحہ ۳۷ پر

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے تعلیمی نظریات

سید محمد حسین شاد بخاری

ہمارے تعلیمی ادارے خواہ وہ مذہبی علوم کے ہیں یا عصری اور سائنسی علوم کے ان میں جاری نصاب تعلیم تحقیق کے جوہر سے خالی ہے۔ یعنی علم برائے تدریس تو ہے برائے تحقیق نہیں۔ اس امت کی بدقسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ جس کا اولین پیغام علم اور تحقیق و جستجو تھی، آج اس کی اکثریت اول تو علم کی روشنی سے ہی محروم ہے اور اگر کہیں تعلیم و تعلم کا سلسلہ ہے بھی تو محض روایتی درس و تدریس کی حد تک۔ جب کہ کائنات کے فطری ارتقائی سفر کے نتیجے میں ہر دور کے بدلتے ہوئے حالات اس چیز کے متقاضی تھے کہ ہمارا نظام تعلیم عصری ضرورتوں کو پورا کرتا اور ملت اسلامیہ کی قیادت کرنے کے لئے نئی نسل کی صحیح سمت میں علمی و فکری رہنمائی کی جا سکتی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب علم کو موثرات زندگی سے ہم آہنگ کر کے اسے تخلیقی اور ایجادی صلاحیتوں سے ہمکنار کیا جاتا۔ یہ کام جہاں وقت طلب ہے وہاں انتہائی مشکل اور محنت طلب بھی ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب پوری قوم من حیث المجموع ذہنی انتشار اور سیاسی زوال کا شکار ہو چکی ہو۔ چنانچہ برصغیر میں بیسویں صدی کے آغاز میں منتشر سیاسی، ملی اور مذہبی حالات میں ایک پر اثر اور حکیمانہ آواز ابھری [illegible] نے بہت تھوڑے عرصے میں مسلم [illegible] اذہان کو متاثر کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے نتیجے میں پاکستان جیسی نظریاتی مملکت وجود میں آ گئی۔

یہ آواز علامہ محمد اقبالؒ کی تھی جس نے نغموں کی صدا سے [illegible] مشرق و مغرب میں [illegible] اقبال نے [illegible]

لیے کارآمد ہو سکتی ہے کہ آپ نے ایک ... اور اعلیٰ افسر کی حیثیت سے قوم والے شاندار، ملی ... اور حال اور مستقبل کے ... کی خوبیاں، سوچ اور فکر کی ... سامنے رکھیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ علمی میدان میں آگے بڑھنے اور علم و عمل، جدوجہد، مفکر کے بغیر ناممکن تھا۔

علامہ اقبال نہ صرف شاعر بلکہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ علامہ نے انسانی زندگی کے لئے جو اقدار اور اصول پیش کیے وہ ابدی صداقت کے حامل ہیں۔ ان کی ساری زندگی کے جملہ معاملات میں ان کے نظریات کی عکاسی ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں فلسفہ تعلیم مربوط اور منظم شکل میں سامنے نہیں آتا لیکن ان کی بعض تقاریر، مضامین اور خصوصاً شاعری سے تعلیم کے بارے میں ان کی فکر کی سوچ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ آپ نے چھ سال تک بطور معلم کام کیا اور ایک استاد کی حیثیت سے تعلیمی مسائل کا گہرا فہم اور شعور رکھتے تھے۔ آپ تعلیم کے بارے میں نہایت جامع، ارفع اور ٹھوس خیالات کے حامل تھے۔ علامہ کے فلسفہ تعلیم میں ضرورت وقت کا احساس، ہمدردی، مستقبل سازی کا تصور، حصول نصب العین کی لگن، احیائے دین کا جذبہ اور نظام تعلیم میں انقلاب برپا کرنے کا عزم ملتا ہے۔ ... روایات کا حامل ہمہ گیر انقلاب انگیز، تخلیقی، وجدانی، عقلی اور انسانیت ساز فلسفہ تعلیم کے تصور نے اقبال کو سب کا محسن کروا دیا ہے۔ مفکر کے تعلیمی نظریات میں اسلامی عقائد اور ایمانیات کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات میں ایسی تجویز ... پیش کرتے ہیں جس سے قلب پریشاں کو تسکین مل سکے اور تعلیم سے ... رسول ﷺ کی محبت، اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ ... پر زور دیتے ہیں اور [illegible]
[illegible]

... ان سے وہ فرماتے ہیں: "تعلیم عمل اور تجربہ کے ... حاصل ہو جائے تب ہی وہ طالب علم نئی طاقت بنتی ہے اور طالب علمی انفرادیت کلی طور پر ہوتی ہے۔"

علامہ کے نظریات سے ہمیں معاشرے میں احترام آدمیت میں اضافہ، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اعلیٰ اقدار کو اپنانے کا درس ملتا ہے۔ وہ علم اور سچائی کی تلاش کے لئے دور دراز کا سفر اختیار کرنے کی تلقین بھی فرماتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے تعلیمی نظریات میں اس بات پر بہت زور دیتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ تعلیم کے سلسلہ میں مشرقی جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ ایسی تعلیم کی تائید نہیں کرتے جو صرف معاشی مقاصد کے حصول کے لئے کی جائے اور زندگی کے روحانی مقاصد مفقود ہوں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب سیم و زر

تصور حقیقت

علامہ اقبال کے نزدیک کائنات آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کو ہمہ مقتدر، طاقتور، حکیم، دانا اور قادر مطلق ہستی یعنی خدا نے بنایا اور وہی اس کائنات کی حقیقت حقیقی ہے۔

اقبال فرماتے ہیں "حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے کل کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں۔" ... کی رائے میں "علامہ اقبال کے تصور حقیقت کی بنیاد عشق پر ہے اور عشق دراصل حرکت، عمل کا دوسرا نام ہے۔"

تصور کائنات

اقبال کے نزدیک ... کائنات ... کل نہیں جس میں کبھی کوئی کمی

بات وجود میں نہ آتی۔ علامہ اقبال نے عطا ہونے والی روشنی میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ کائنات صرف اتفاق کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اپنے اندر ایک اہم اور بامعنی صداقت رکھتی ہے۔ اس میں وسعت بھی ہے اس کو تکمیل تو حاصل نہیں بلکہ اس میں پھیلاؤ اور ارتقاء اور نمو کے امکانات مضمر رکھے گئے ہیں۔ یہ زمان و مکان کی پابند ہونے کے باوجود نئی نئی شکل کا دیاں کرتی رہتی ہے۔ یہ لامحدود وسیع اور کھلی فضا، انسان کی تخلیقی جدوجہد کے لئے میدان مہیا کرتی ہے۔ انسان ایک طرف تو کائنات پر قبضہ حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف اپنی انفرادیت کو درجہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جس نے اس سے رونق کائنات میں تربیت، تنظیم، حسن اور انفرادیت پیدا کی ہے۔ یہاں تک کہ خود اپنی ایجاد و تصرف میں خود قدرت کا حریف تک بن بیٹھا ہے۔

علامہ اقبال کائنات اور خدا کے تعلق کی تفہیم کے لئے تمدنی ترقی کو ضروری سمجھتے تھے وہ کائنات کو محض دھوکہ یا بے جان نہ سمجھتے تھے۔ قرآنی تعلیمات ان کے فلسفیانہ تصورات ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

"ہم نے زمین و آسمان اور ان کی تمام چیزوں کو یوں ہی بے کار پیدا نہیں کیا بلکہ ان کی تخلیق حقیقت پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (سورہ الدخان آیت ۳۸، ۳۹)

علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں اس نظریہ کو یوں بیان فرمایا ہے:

"کائنات کی آفرینش اس لئے نہیں ہوئی۔ تخلیق کا عمل ایک مسلسل ہے بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جو اعتراف کرتا ہو کہ وہ کوئی جامد کائنات نہیں تو ایک ایسا موضوع جس کی تکمیل ختم ہو چکی اور جو بے حرکت اور ناقابل تغیر و تبدیل ہے۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے اس کے باطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے۔"

اس سے کائنات کے قرآنی تصور کی توثیق ہوتی ہے۔ ۔۔۔ جس میں اس

حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

تصورِ علم

اقبال نے علم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ علم انسان کی نوعیت تصوری ہے اور تصوری علم کا ایک حربہ ہے جس کے ہاتھ میں لے کر انسان حقیقت مطلقہ کے مرئی یا قابل مشاہدہ پہلوؤں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم درحقیقت شعور ہی کے ایک مرتب اور منظم بیان کا دوسرا نام ہے لہٰذا شعور کو حیات ہی کے خاص اور حیاتی اصول کی شکل ٹھہرانا چاہئے۔ ان کے نزدیک علم:

۱۔ باطل شکن ہوتا ہے اور باقاعدہ نظام کے تحت وجود پاتا ہے۔

۲۔ حق نما، حرکت پذیر اور متنوع ہوتا ہے۔

۳۔ دل، نظر اور فکر و وجدان کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔

۴۔ علم، زمانہ، حیات اور کائنات کو ایک ہی وحدت کے مظاہر تصور کرتا ہے اور یہ کہ سب ارتقائی مدارج طے کر رہے ہیں اور ان کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہو جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

ان کے مطابق علم میں وجدانی صفات بھی موجود ہوتی ہیں اس لئے وہ علم

خاص مت کے مسائل کے حل کے لیے بھی تک کام کرتا ہے۔

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

علامہ فرماتے ہیں

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے اگر دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم علم حق کی ابتدا ہے۔"

علم حق اول حواس آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور

علم کی خصوصیت

علامہ اقبالؒ کے نزدیک علم کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ بالبصر (بصیرت افروز)

۲۔ کلیمانہ مزاج

۳۔ حکیمانہ نظر (فکری و تحلیلی)

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

ذرائع علم

۱۔ وحی الٰہی

۲۔ حواس و ادراک، عقل، فہم، فکر، مشاہدہ، نفس، مشاہدہ کائنات

۳۔ ورائے حواس ادراک، قلب، وجدان، صوفیانہ واردات

علم کے مبدا

۱۔ وحی الٰہی، کلام پاک، شریعت اور تعلیم کتاب (تفسیر وغیرہ)

۲۔ عقل و فہم و ادراک، فلسفہ و سائنس، علم ہندسہ، حکمت، دانشری تعلیم

۳۔ مشاہدہ نفس، وجدان اور صوفیانہ واردات، روحانی علوم، روحانی علوم کی دینی تفصیلات

۴۔ حواس، حسی علوم

۵۔ تجربہ و مشاہدات، سائنس کی شاخیں، معاشرتی علوم، تجارت کے اصول مبادی

۶۔ نفسیات، علم الناس، زبان و ادب، سیاسیات، تعلیم

۷۔ کائنات، آرٹ، علم نجوم، جغرافیہ، سائنس

(الف) تعلیم کے انفرادی مقاصد

۱۔ انفرادی خودی کی بیداری و استحکام

اقبالؒ کے نزدیک تعلیمی سرگرمیوں کا مقصد انسانی شعور کے روشن نقطہ (خودی) کو بیدار و مستحکم کرنا بھی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق محکم تو صور اسرافیل

علم از سامان حفظ زندگی است
علم از اسباب تقویم خودی است

۲۔ نفس ناطقہ کی تکمیل

علامہ کے نزدیک کامل طریقہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ محض ذہنی علمی قوتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔

تعلیم کے اجتماعی مقاصد

علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم کے اجتماعی مقاصد درج ذیل ہیں

۱۔ اجتماعی خودی یا قومی انا کا تسلسل و تحفظ
۲۔ قومی حق کا سلسلہ یا تحفظ قائم رکھنا
۳۔ نصب العین کا شعور
۴۔ اسلامی سیرت و کردار کی تشکیل
۵۔ کرداری اوصاف پیدا کرنا
۶۔ کائنات کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت کا احساس
۷۔ دینی و دنیوی علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنا
۸۔ جلالی و جمالی قوتوں کا توازن قائم کرنا
۹۔ شعور وحدت اور وحدت کردار پیدا کرنا
۱۰۔ تصرف احوال کے لئے درس جہاد
۱۱۔ آرزومند دل عطا کرنا
۱۲۔ جرات رندانہ پیدا کرنا
۱۳۔ چشم بصیرت عطا کرنا
۱۴۔ اخلاص نظر پیدا کرنا
۱۵۔ کشمکش حیات کے لئے تیاری
۱۶۔ تعمیر اخوت و محبت و احترام آدمیت

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

عناصر تعلیم

۱۔ بچہ / طالب علم — ۲۔ استاد
۳۔ علم — ۴۔ درسگاہ
۵۔ حکومت — ۶۔ معاشرہ
۷۔ کائنات

تعلیم کے ادارے

۱۔ ماں کی گود — ۲۔ فرد
۳۔ گھر کا ماحول — ۴۔ درس گاہ
۵۔ معاشرہ — ۶۔ ماحول
۷۔ کلچر — ۸۔ تہذیب و تمدن
۹۔ کائنات

تدوین نصاب تعلیم

تعلیم و نصاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔ نصاب وہ آلۂ کار ہے جس کے ذریعہ مقاصد کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

اقبالؒ تدوین نصاب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہئے جس میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو تاکہ طلباء ان کے مطالعہ کے بعد کشمکش حیات میں استقلال، خودداری اور اعتماد کے ساتھ حصہ لے سکیں۔

تعلیم نسواں

اقبالؒ تعلیم نسواں کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اقبالؒ عورتوں کی تعلیم کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ایسی تعلیم کا بندوبست کیا جائے جس کی مدد سے مسلم معاشرے کی خاندانی فضا مغربی اثرات سے

مخلوط ہے۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ عورتوں کی تعلیم اس قدر ہو کہ وہ اپنے شوہر سے با آسانی تبادلۂ خیال کر سکیں اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی ٹھیک ٹھیک نشوونما ہو اور عورت کے اولین فرائض کو بحسن و خوبی انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔ نیز مخلوط تعلیم پر علامہ اقبالؒ کسی قیمت پر تیار نہ تھے۔

اقبالؒ خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے فرماتے ہیں:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

معلم کا کردار

اقبالؒ اپنے نظام تعلیم میں معلم کو نہایت اہم مقام دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ معلم قوم کے محافظ و معمار ہیں۔ ان کے خیال میں معلم ایسا ہو جو اپنے طلبہ میں اوصاف حمیدہ پیدا کرے:

تھا فیض یہ مکتب کا کہ فیضان نظر تھا
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

نظام تعلیم کا مقصود

"ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں"

اقبالؒ کی تعلیمات کا ممتاز ترین نصب العین فلسفۂ حیات اور نظام تعلیم میں موجود، عمل اور عشق کو انقلاب پذیر اور ارتقاء پسند انسانیت میں تبدیل کرنا قرار دیا ہے۔ مذہب و سائنس کو بڑی اہمیت دی ہے۔

موجودہ نظام تعلیم پر تنقید

اقبال فرماتے ہیں، "تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ خودکشی کرے گی۔"

"جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا"

فرماتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبالؒ مسلمان طلبہ کے لئے مغربی نظام تعلیم کو زہر قاتل سمجھتے تھے۔

۱۔ مغربی تعلیم طلبہ کو بے ادب بناتی ہے

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

۲۔ مغربی تعلیم ظلمات کا گہوارہ بن گئی ہے

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

۳۔ بین الاقوامی سطح پر تعلیم پر تنقید

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

فرد کی انفرادیت اور معاشرے کی اجتماعیت

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے تعلیمی نظریات پر مختصر سی بحث کے بعد اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہؒ کے نزدیک ضرورت اس امر کی ہے کہ نظام تعلیم میں روحانی اور مادی قدروں کا توازن قائم رکھا جائے۔ طالب علم کو اپنی روحانی صفائی کے لئے تلاوت کلام پاک اور احادیث نبوی ﷺ یاد کرنا اور ان تعلیمات کو اپنے کردار کا جزو لازم بنانا لازمی قرار دیا جائے۔ درسگاہوں میں نماز کا باقاعدہ انتظام ہو اور بزرگ اساتذہ اس خدمت کو انجام دیں۔ جماعتوں میں مذہبی اور تاریخی موضوعات پر بحث اور تقاریر کے لئے مضامین و عنوانات دیے جائیں۔ نیز درسگاہوں میں مذہبی تہواروں کو احترام کے ساتھ منایا جائے۔ اس طریقہ پر ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ نظام تعلیم کے ذریعہ روحانی اور مادی قدروں کی عظمت کا ہمارے طلبہ میں صحیح شعور پیدا ہو اور انسان اور کائنات، روح اور مادہ اور حقیقت و مجاز کی قدر و منزلت کو الگ الگ پہچان بھی سکیں۔ ایسا نظام تعلیم جو روحانی اور مادی دونوں اقدار کا حامل ہو گا وہی مکتب اسلامیہ کا صحیح ترجمان کہا جا سکے گا۔

صاحب تدبر قرآن کی یاد میں

ڈاکٹر گل رحیم جوہر

مدرسۃ الاصلاح (قصبہ سرائے میر ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں ایک دینی درسگاہ ہے یہ درسگاہ مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا شبلی نعمانیؒ کے تعلیمی نظریات پر قائم ہے۔ ادب عربی اور قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس کا خاص مطمح نظر ہے اور تقریباً نوے سال سے وہ اسی مطمح نظر کی خدمت کر رہی ہے۔ صاحب تدبر قرآن حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ اسی مدرسہ کے نمایاں ترین فاضل اجل تھے۔ ۱۵؍ دسمبر ۱۹۹۷ء کو اپنے ہزاروں بالواسطہ اور بلاواسطہ شاگردوں کو داغ مفارقت دے گئے۔ یہ لوگ ان کی لکھی ہوئی عظیم تفسیر تدبر قرآن کے حوالے سے ان کے شاگرد تھے۔ فہم قرآن کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جن کو مولانا کا درس سننے اور ان کی تفسیر تدبر قرآن سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی۔

تدبر قرآن کیا ہے؟ علم و حکمت، فکر و تدبر اور تحقیق کا ایک قرآنی خزانہ ہے جو کہ مولانا اصلاحیؒ نے اپنے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے اصول تفسیر کی روشنی میں تقریباً نصف صدی میں مکمل کیا ہے۔ خود مولانا فراہیؒ کو اپنے اصولوں اور مقدمات تفسیر کے مطابق قرآن حکیم کی مکمل تفسیر لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک ایسا لائق اور محنتی شاگرد عطا فرمایا جس نے متواتر کئی سال ان کی خدمت میں رہ کر بہت محنت، عرق ریزی اور ذوق و شوق سے فہم و تدبر قرآن کے اصول سیکھے اور ان کے زیر تربیت رہ کر قرآن کریم کا گہرا تحقیقی مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے استاد کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

مولانا فراہیؒ اپنی تفسیر نظام القرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کر دوں اور قرآن مجید کی ایک سادہ و صاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ہر آیت کا مفہوم اس کی مناسبت دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیا ہے اور اس سے سیاق کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس جد و جہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اسے عقل و نقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔"

آیات قرآن کے باہمی تعلق اور تفسیر آیات بالآیات کے ساتھ ساتھ فہم قرآن کے لئے تیسرا بڑا داخلی وسیلہ عربی مبین کا اعلیٰ ذوق اور اس میں مہارت ہے۔ مولانا اصلاحیؒ اپنی فطری رجحان طبع اور مدرسۃ الاصلاح کی تربیت و مشق کی وجہ سے ادب عربی کے بہت بڑے ماہر تھے اور قرآن کی زبان یعنی قدیم عربی زبان و ادب پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔

"تدبر قرآن" میں فہم قرآن کے مندرجہ بالا تین داخلی وسائل کے ساتھ مولانا اصلاحیؒ نے سنت متواترہ و مشہورہ، احادیث و آثار صحابہؓ، کتب تفسیر میں سے ابن جریر، تفسیر رازی، تفسیر زمخشری، قدیم آسمانی صحیفوں اور تاریخ عرب کے ذریعہ قرآن حکیم سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تفسیر کے سلسلہ میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ علوم قرآن میں سے "نظم قرآن" اجاگر کرنا اور اس کے مطابق پورے قرآن حکیم کی تفسیر کو نو ضخیم جلدوں میں مرتب کرنا ہے۔

اس علم کے متعلق علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصل خزانہ اس کے نظم و ترتیب ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

مولانا حمید الدین فراہیؒ اس علم نظم قرآن کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ اب تک دریافت ہو سکا ہے۔"

مولانا اصلاحیؒ نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس مدفون خزانہ سے قرآنی علم و حکمت کے جواہر ریزے نکالنے میں صرف کیا اور اب شائقین علوم قرآن اور فہم قرآن کے طالب علموں کے ہاتھوں میں تدبر قرآن کی صورت میں ایک ایسی تفسیر موجود ہے جس میں ملحدین کے اس مشہور اعتراض کا کافی و شافی جواب موجود ہے کہ قرآن ایک بے نظم، بے ترتیب اور منتشر کتاب ہے۔

صاحب تفہیم القرآن سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا اصلاحیؒ ہم عصر اور ہم عمر تھے دونوں کی فکر اور ذوق و جستجو کا مرکز و محور قرآن حکیم ہے۔ مولانا اصلاحیؒ تو استاد حمید الدین فراہیؒ کے براہ راست شاگرد تھے لیکن مولانا مودودیؒ بھی حیدرآباد کے اس دار العلوم میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے جس کے پرنسپل استاد فراہیؒ تھے۔

تفہیم القرآن اور جماعت اسلامی دونوں کا سن آغاز ۱۹۴۱ء ہے اور تقریباً اسی زمانہ میں مولانا اصلاحیؒ تدبر قرآن لکھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بعد میں ان کی اس کاوش کی ابتدائی دو کتابیں "مبادی تدبر قرآن" اور "مجموعہ تفاسیر فراہی" مکتبہ جماعت اسلامی کی طرف سے شائع ہوئیں۔

تفہیم القرآن میں بھی نظم قرآن اور تفسیر قرآن بالقرآن اور ہر سورت کا عمود یعنی مرکزی مضمون متعین کرنے کا بہت التزام کیا گیا ہے۔ نیز صحیح احادیث، آثار صحابہؓ، صحف سماوی اور تاریخ و جغرافیہ عرب سے بہت استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس میں تدبر قرآن کے برعکس لغت و معانی اور صرفی و نحوی مباحث بہت کم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تفہیم القرآن عام تعلیم یافتہ طبقہ کی ضروریات اور ان کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے جب کہ "تدبر قرآن" اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین طبقہ اور علماء کرام کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ اس طبقہ کی ذہنی و فکری اصلاح کو پھر عام مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔

مولانا اصلاحیؒ جماعت اسلامی کے گروہ اولین سے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی عدم موجودگی میں وہ کئی بار جماعت کے قائم مقام امیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء کے ماچھی گوٹھ کے تاریخی اجتماع ارکان تک دونوں دعوت و تحریک کے میدان میں ہم سفر رہے۔ اس طویل رفاقت

میں دونوں بزرگ ہم خوالہ و ہم پیالہ رہے حتیٰ کہ جیل میں بھی ساتھ ساتھ رہے۔ جب قادیانی مخالف تحریک کے دوران مولانا مودودیؒ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور ان کو عام قیدیوں سے علیحدہ کر کے پھانسی کی سزا پانے والے قیدیوں کے کپڑے پہنائے گئے اور ان کے اپنے کپڑے مولانا اصلاحی کو دیئے گئے تو انھوں نے سید مودودیؒ کے کپڑے چوم لئے تھے۔

دونوں کا اسلوب تحریر بھی تقریباً ایک جیسا ہے۔ روداد جماعت اسلامی میں آج بھی مولانا اصلاحیؒ کے کئی قیمتی خطبے درج ہیں۔ اس کے علاوہ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، تزکیہ نفس، حقیقت تقویٰ اور حقیقت شرک و توحید، تنقیدات و توضیحات ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ ان کا مطالعہ کرتے وقت اگر قاری کو پہلے سے مصنف کا علم نہ ہو تو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مولانا مودودیؒ کی تحریر ہے یا مولانا اصلاحی کی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی تحریر و تقریر اور تفسیر کا منبع اور ماخذ قرآن و سنت متواترہ اور احادیث صحیحہ ہے۔ اس لئے ان کا ذائقہ بھی ایک جیسا ہے جیسا کہ مختلف برتنوں میں ایک ہی چشمہ صافی سے لئے ہوئے پانی کا ہوتا ہے۔

جماعت اسلامی سے مولانا اصلاحیؒ کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ انتخابات میں حصہ لینے کے قائل نہ تھے بلکہ اصلاح معاشرہ کے ذریعہ اصلاح حکومت کرنا چاہتے تھے جب کہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ تھا کہ انتخابات میں براہ راست شرکت ہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا جائے گا کہ ہم کتنا اصلاح معاشرہ کا کام کر چکے ہیں۔ اس مسئلہ پر دونوں کا مفصل موقف سننے کے بعد کل پاکستان اجتماع ارکان میں رائے شماری ہوئی تو بھاری اکثریت نے مولانا مودودیؒ کے موقف کے حق میں ووٹ دیا۔ اس کے بعد قرآن و سنت کے علم و تحقیق کے یہ دونوں مجمع البحرین ایک ہی جماعت میں ساتھ نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ مولانا اصلاحیؒ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے اور اپنے طرز پر دعوت دین کا کام جاری رکھا۔

شاید اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہو گی کیونکہ اب آپ یکسو ہو کر اپنی

عظیم تفسیر تدبر قرآن لکھنے کے لئے مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔ جس سے اب جماعت اسلامی ہی کے کارکن، اس کی برادر تنظیمیں اور اس کے مدرسین قرآن سب سے زیادہ استفادہ کر رہے ہیں۔

جماعت اسلامی کی تقریباً ہر لائبریری، مکتبہ، بک اسٹال اور اجتماعات میں آپ کو تفہیم القرآن کے ساتھ ساتھ تدبر قرآن بھی ملے گی۔ جماعت اسلامی کے مرحوم نائب امیر اور مدیر ترجمان قرآن خرم مرادؒ آپ کے نمایاں شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے فہم قرآن پر کئی کتابیں لکھیں اور کئی قرآنی تربیت گاہیں منعقد کیں۔ جن میں وہ شرکاء کو تدبر قرآن اور مولانا اصلاحیؒ کی دوسری کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے کی طرف توجہ دلاتے۔

خرم مرادؒ کے علاوہ ڈاکٹر اسرار احمد اور جاوید احمد غامدی جیسے آپ کے لائق شاگرد تدبر قرآن کے حوالے سے اپنی اپنی طرز پر قرآنی فکر و تدبر کی اشاعت کر رہے ہیں۔ راقم الحروف کے زیر انتظام ایک چھوٹا سا ادارہ پیغام قرآن اکیڈمی کے نصاب میں بھی آپ کی قرآنی نگارشات شامل ہیں۔ یوں چراغ سے چراغ جل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ بیسویں صدی کے اس عظیم عالم دین اور مفکر قرآن کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور قرآن کے سلسلہ میں ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین۔

دسویں قسط

یہودیت

یہودی فرقے

۱۹۸ ق م فلسطین پر یونانیوں کے تسلط کے بعد دینی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے یہود مختلف فرقوں میں منقسم ہوگئے۔ ان کے اہم فرقے درج ذیل ہیں۔

۱۔ خاسدیم (CHASIDIM)

خاسدیم کے معنی اتقیاء کے آتے ہیں یہ لوگ توریت کی محافظت کے سلسلہ میں انتہائی غیرت مند ہیں۔ یہ فرقہ ([illegible]) کے عہد میں قائم ہوا جو داؤد علیہ السلام کے گہرے دوست تھے۔

ان کے نمایاں عقائد درج ذیل ہیں۔

۱۔ توریت کے ساتھ ساتھ تلمود کی قداست پر اعتقاد۔

۲۔ حشر و نشر پر یقین۔

۳۔ احبار و علماء کی معصومیت کا اعتقاد۔

مسیح علیہ السلام نے چونکہ ان کے باطل افکار و عقائد اور اخلاقی فساد و بگاڑ پر شدید تنقید کی تھی اس لئے انجیل مرقس کے مطابق اس فرقہ نے مسیح علیہ السلام کے قتل کی سازش میں بھرپور حصہ لیا۔

ہرکانوس کے عہد میں (۱۳۵ - ۱۰۵ ق م) یہ فرقہ فریسین کے نام سے معروف ہوا۔ جس کے معنی علیحدگی پسند کے آتے ہیں۔

۲۔ صدوقیون

امام ابن حزم کے بقول یہ فرقہ سلیمان علیہ السلام کے زمانے کے ایک مشہور و معروف کاہن "صدوق" کی جانب منسوب ہے۔ یہ فرقہ نہ تو حشر و نشر پر

یقین رکھتا ہے اور نہ ہی ارواح و ملائکہ پر۔ ایسے ہی یہ تقدیر کے بھی قائل نہیں ہیں۔

رہے مصادر تو اسفار قدیم تو ان کے نزدیک معتبر ہیں لیکن تلمود کی قداست پر ان کا یقین نہیں۔

۳۔ عنانیون

اس فرقہ کی بنیاد آٹھویں صدی کے اواخر میں، شہر بغداد میں "عنان بن داؤد" کے ہاتھوں پڑی۔ انھیں "قرائین" بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فرقہ صرف عہد نامہ قدیم پر یقین رکھتا ہے اور "قرۃ" کے معنی کتاب یا مکتوب کے آتے ہیں اور لفظ "قرۃ" یا مکتوب یہود کے یہاں عہد نامہ قدیم کے لیے مستعمل تھا۔

یہ فرقہ نہ تو تلمود کی قداست کا قائل ہے اور نہ ہی علماء و احبار کی معصومیت کا۔ اس فرقہ کے افراد آج بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

۴۔ سامرہ۔

یہ فرقہ بنو اسرائیل سے بالکل مختلف ہے، ان کا ایک خاص مرکزی معبد بھی ہے۔ سامریوں کے سردار "منسی" نے ایک غیر یہودی "سنبلط" کی لڑکی سے شادی کرلی۔ چنانچہ یروشلم کے مذہبی رہنماؤں نے انھیں طلاق دینے یا ان کے مرکزی معبد کے پاس واقع مذبح کے قریب نہ پھٹکنے کا حکم دیا۔ منسی طلاق دینے کے لئے رضامند ہو گئے لیکن ان کے خسر نے طلاق نہ دینے کی صورت میں جبل جرزیم پر ایک خاص ہیکل بنانے کا عہد کیا، اور ۳۳۲ ق م میں انھوں نے جبل جرزیم پر ہیکل تعمیر کردیا جو آگے چل کر ہیکل سامری کی بنیاد بنا۔ ۱۰ ق م میں یہ فرقہ دو فرقوں الفاہ اور کوسانیہ میں تقسیم ہوگیا۔

یہودیوں نے انھیں یہودیت سے خارج کرنے کی پوری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بیرونی کا خیال ہے کہ بخت نصر کے یروشلم پر حملے کے دوران اس فرقہ نے اس کی مدد کی تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ اس عام تباہی سے محفوظ رہ گئے تھے۔ آج بھی یہ نابلس کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد صرف ۳۲۷ ہے۔

روداد چمن

ادارہ

جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب:

جامعۃ الفلاح جس طرح طلبہ کی تعلیم پر توجہ دیتا ہے اسی طرح ان کی تربیت پر بھی خصوصی نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ طلبہ کی ہمہ جہتی ترقی اور تربیت کے پیش نظر یہاں جمعیۃ الطلبہ قائم ہے۔ جسکے تحت تقریر و تحریر، باغبانی اور کھیل، خدمت خلق و تیمارداری، صفائی ستھرائی، لائبریری و دار المطالعہ اور اسٹور وغیرہ کی جملہ ذمہ داریاں طلبہ کے سر ہوتی ہیں، وہ ہر سال اپنے ساتھیوں کا انتخاب کرتے ہیں، اس طرح مذکورہ شعبوں کے کام کی تربیت حاصل کرنے کا انہیں موقع فراہم ہوتا ہے۔

امسال جن طلبہ کا انتخاب عمل میں آیا ہے وہ درج ذیل ہیں:-

سکریٹری جمعیۃ الطلبہ	ذیشان احمد	اعظم گڑھ
معتمد خطابت اردو	شمیم اختر	ارریہ
معتمد خطابت عربی	عبدالحئی	مدھوبنی
معتمد خطابت انگریزی	بشیر احمد	کشمیر
لائبریرین	احتشام الدین	پٹنہ
معتمد الجمعیۃ ...	مجاہد رضا خاں	جل گاؤں

معتمد اسٹور	[illegible]	[illegible]
معتمد نظم	محمد عرفان	ارریہ
معتمد خدمت خلق	عبدالمجید	کشمیر
معتمد صفائی و آبپاشی	محمد رضوان عثمانی	

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان ذمہ داروں کو اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق بخشے۔

نو واردان بساط چمن:

بحمد للہ جامعہ اپنے ارتقائی سفر کی منزلیں تیز گامی سے طے کر رہا ہے، چنانچہ ہر سال تعلیمی و تربیتی فرائض و واجبات کے نو بہ نو تقاضے سامنے آتے ہیں جنکی تکمیل کیلئے مزید اساتذہ و اتالیق کی ضرورت در پیش ہوتی ہے، اس لئے ہر سال ہی چند آزمودہ کار ارباب علم و آگہی کے ذریعہ بعض گوشہ ہائے چمن کی نئی آلہ بندی ہوتی ہے۔ امسال جامعہ کے علمی قافلہ میں شریک ہونے کی سعادت جن لوگوں کو حاصل ہوئی ان کا مختصر تعارف ہدیہ ناظرین ہے:-

جناب مولانا عبدالحسیب صاحب فلاحی کی تقرری طلبہ منزل کیلئے ہمہ وقتی نگراں کی حیثیت سے عمل میں آئی ہے۔ جناب ماسٹر اعجاز احمد صاحب انصاری کا تقرر شعبہ ثانوی میں سائنس ٹیچر کی حیثیت سے ہوا اور جناب ماسٹر رضی احمد صاحب کی تقرری شعبہ ابتدائی میں، اسی طرح معاون لائبریرین کی حیثیت سے جناب عبدالرحمن صاحب اعظمی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جامعۃ الصالحات کے شعبہ ثانوی نسواں میں ریاضی کے ٹیچر کی حیثیت سے محترمہ نجمہ صاحبہ اور فارسی کے استاذ کی حیثیت سے محترمہ ... فلاحی صاحبہ کی تقرری عمل میں آئی ہے۔

ادارہ حیات نو ان تمام حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ جل جلالہ ان تمام مدرسین کو حسن و خوبی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور جامعہ کی ہمہ جہتی تعمیر و ترقی میں فعال تعاون پیش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

خوشی کی بات:

یہ اطلاع دیتے ہوئے ہمیں بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ محترم عفان احمد صاحب فلاحی طبیہ کالج، علی گڑھ میں لیکچرر ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور تدریس کے ذریعہ فریضہ اقامت دین کیلیے جد و جہد کرنے کی انہیں توفیق بخشے۔ آمین!

الوداعی تقریب: ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو محترمہ قیصری صاحبہ جو بارہ سال سے شعبہ اعلیٰ کلیۃ البنات میں تدریسی فرائض انجام دے رہی تھیں مستعفی ہو گئیں۔

ان کے اعزاز میں ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ء کو ایک عصرانہ کا پروگرام رکھا گیا۔ جس میں معلمات کے ساتھ ذمہ داران جامعہ نے بھی شرکت کی۔

سابق ہیڈ معلمہ محترمہ شفقہ وقار صاحبہ نیز محترمہ ساجدہ فلاحی صاحبہ نے ان کے جانے پر تمام معلمات کی جانب سے حزن و ملال کا اظہار کیا نیز انھیں نصیحت کی کہ جس طرح وہ اپنے مادر علمی کی خدمت کرتی رہیں اسی طرح وہ گھر رہ کر بھی اس کو فراموش نہیں کریں گی۔

محترم مہتمم شعبہ نسواں ماسٹر مسیحا قادری صاحب اور نائب ناظم جامعہ جناب مولانا ابوالبقاء صاحب ندوی نے انھیں بیش قیمت اور مفید ہدایات سے نوازا۔

خطوط و رسائل

مدیر محترم ________ سلام مسنون

امید ہے کہ مزاج گرامی مع رفقاء بخیر ہوگا۔

مدت کے بعد ماہنامہ "حیات نو" کا شمارہ فروری ۱۹۹۰ء دیکھنے کو ملا۔ دیکھتے دیکھتے جب صفحہ ۲۰ پر پہنچا اور ایک مضمون کا عنوان "فکر فراہی کا امین۔ امین احسن اصلاحی" سامنے آیا تو میں ایک دم رک گیا۔ اصل میں، بتاتا چلوں کہ اس وقت "مدرسۃ الاصلاح" کے اندر میں ہی ایک ایسا شخص ہوں جس کو [illegible] میں مولانا فراہی کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہے۔

مذکورہ مضمون میرے لیے بڑی دلچسپی کا باعث تھا۔ استاذ مرحوم نہ صرف از عربی اول تا عربی ہشتم میرے استاذ رہے بلکہ آٹھ سال تک ہیں شب و روز میں ان کے ساتھ قیام بھی رہا۔

اس لیے مضمون کو بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ پورا مضمون پڑھنے کے بعد کئی جگہ مجھے تسامح کا احساس ہوا جیسے۔

(۱)۔ "اس وقت علامہ فراہی مدرسہ پر طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔" یہ صحیح نہیں۔ بلکہ علامہ فراہی اساتذہ کو درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اور استاذ مکرم جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی درس قرآن کے قاری ہوا کرتے تھے۔ وہ حافظ قرآن تھے۔ چنانچہ مولانا فراہی ان کو "حافظ صاحب" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

(۲)۔ رسالہ "الاصلاح" ۱۹۲۸ء میں جاری ہوا اور ۱۹۳۹ء میں جب دوسری "جنگ عظیم" شروع ہوئی اور ضرورت کی اشیاء نایاب ہو گئیں تو رسالہ کو مجبوراً بند [illegible] اس کا ایک ہی مضمون نگار تھا۔

(۳)۔ "شاید اس کے چند شمارے مولانا اختر احسن اصلاحی کی ادارت میں بھی شائع ہوئے" یہ بات بالکل غلط ہے۔ استاذ مکرم مولانا اختر احسن اصلاحی کی ادارت میں "الاصلاح" کا ایک شمارہ بھی شائع نہیں ہوا۔ میں مولانا اختر احسن اصلاحی کی آخری سانس لینے تک ان کی پاس موجود تھا۔